اسلامی نظام دفاع اور عہد جدید

*زیبا افتخار

ABSTRACT

The rapid and vast advancements in the knowledge base of science, technology and weaponry has brought major modifications in modem warfare. Despite immaculate ancient military expertise and war strategy; the advancements in technology have left the old warfare techniques behind and has rendered them obsolete and irrelevant. The weapon systems employed in wars fought by our forefathers are limited as museums artifacts as advanced munitions has outmoded these weapons fast. Consequently, it is widely believed that ancient rules of military engagement cannot be employed nowadays.

However, the aforesaid believe can be proved wrong upon detailed perusal of Prophet Muhammad (PBUH)'s defense rules and guidelines for waging war. Along with the commandment of undertaking Jihad, Islam explicitly laid down dos and don'ts of the battlefield and explained detailed defensive strategies. These teachings have an ingrained flexibility and room for amendment for the modern day. Therefore, to this very day, Muslim forces can employ these principles in the modern battleground and experience great feats like their predecessors.

Keywords: Defence,Prophet Muhammad, Jihad, Islam, War,Defensive Strategies.

حالیہ چند سالوں میں علوم وفنون کی ترقی سے جنگ کے طریقوں اور اصولوں میں اتنا کچھ انقلاب آگیا ہے کہ قدیم زمانے کی لڑائیاں، عسکری مہارتوں کے باوجود آج کے دور میں عجیب وغریب معلوم ہوتی ہیں۔ ہتھیاروں میں اتنی ترقی ہو چکی ہے کہ قدیم ہتھیار صرف عجائب خانوں میں سجائے جانے کے قابل رہ گئے ہیں۔ پہلے فوجی لشکر ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد پر مشتمل ہوتا تھا۔ آج انتہائی تباہ کن جنگیں، چند اشخاص اور چند مشینوں کے ذریعہ لڑی جا سکتی ہیں اور چند منٹوں میں پورے کے پورے ملک صفحہ ہستی سے مٹائے جاسکتے ہیں۔ انہی وجوہات کی بناء پر یہ خیال عام ہے کہ قدیم زمانے کی جنگوں کا تذکرہ چاہے مورخین کے لیے کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، ان کا عملی فائدہ آج کچھ بھی نہیں۔ لیکن حقیقتاً عملی طور پر دیکھا جائے تو یہ خیال درست نہیں۔ ایک غیر مسلم معاشرہ یعنی برطانیہ میں جب حربیات کے طالب علم کو پہلا درس دیا جاتا ہے تو وہ کچھ یوں ہوتا ہے۔

* ڈاکٹر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی، کراچی
برقی پتا: zebaiftikhar@uok.edu.pk
تاریخ موصول: ۲۹/۱/۲۰۱۷ء

فوجی تاریخ کو بلاشبہ عسکری تعلیم کے مطالعہ میں سب سے اہم جگہ ملنی چاہیے۔ "کیونکہ اصول جنگ کا صحیح مفہوم اور ان کے اطلاق کو سمجھنے، اور یہ معلوم کرنے کا کہ ہر فوجی کاروائی میں انسانی فطرت ہی سب سے زیادہ موثر حصہ لیتی ہے، یہی سب سے بہتر طریقہ ہے"۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ انسانی فطرت نہیں بدلتی، وہ محرکات جن کی وجہ سے عموماً جنگیں پیش آجاتی ہیں وہ بھی تقریباً ہر دور میں یکساں ہی رہے ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر زمانے میں جنگی اصول اور قواعد بھی یکساں رہے ہیں یا عسکری ہتھیاروں کی طرح ان میں بھی تغیرات آئے ہیں؟ کیونکہ ہر زمانے کے اپنے مخصوص حالات ہوتے ہیں، جن پر ماضی کے بہت سے اسباق کا انطباق نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا گزری ہوئی معرکہ آرائیوں کے مطالعہ سے پورا فائدہ اسی وقت اٹھایا جاسکتا ہے جب نہایت احتیاط سے یہ معلوم کر لیا جائے کہ سپہ سالاروں نے اصولوں کا انطباق کس طرح کیا اور اس کے کیا نتائج پیدا ہوئے؟

انسانی ارتقاء کی تاریخ میں متعدد الہامی اور انسانی نظریات متعارف ہوئے، ہر قوم نے اپنے اپنے نظریات (خواہ وہ الہامی ہوں یا انسانی) کے مطابق اپنی اجتماعی زندگی کے اصول متعین کیے۔ انہی میں عسکری اصول بھی ہوتے تھے۔ ان عسکری اصولوں کو یا تو عالمی سطح پر قبول کیا گیا یا اسے مسترد کر دیا گیا۔ اسلام کے پیش کردہ عسکری اصولوں کو نہ صرف عالمی سطح پر قبول کیا گیا، بلکہ اپنے اپنے نام کی تختی لگا کر ہر قوم نے اس کا کوئی نہ کوئی حصہ اپنا لیا۔ عہد نبوی کی جنگیں تاریخ انسانی میں غیر معمولی طور سے ممتاز ہیں، ان میں اکثر دو گنا، تین گنا اور بعض اوقات دس گنا بڑی طاقت سے مقابلہ ہوا، اور قریب قریب ہمیشہ ہی فتح ہوئی۔ مدینہ کی ریاست سے ہونے والی فتوحات کا آغاز، روزآنہ دوسو چوہتر (۲۷۴) مربع میل کی اوسط سے وسعت اختیار کرتا ہے اور صرف دس سال کے بعد جب رسول اللہ کی وفات ہوئی تو دس لاکھ سے بھی زیادہ مربع میل کا رقبہ آپؐ کے زیر اقتدار آچکا تھا۔ ہندستان اور پاکستان کے برابر وسیع علاقے کی فتح میں جس میں یقیناً لاکھوں کی آبادی رہی ہوگی، دشمن کے بمشکل ڈیڑھ سو آدمی قتل ہوئے۔ جبکہ مسلمان فوج کا ماہانہ ایک سپاہی شہید ہوا۔ یعنی ان تمام غزوات میں جملہ ایک ہزار اڑتالیس (۱۰۴۸) افراد کام آئے، جن میں مسلمان شہداء کی تعداد ایک سو پچیس (۱۲۵) اور کفار کے نو سو تئیس (۹۲۳) آدمی قتل ہوئے۔ قیدیوں کی تعداد تقریباً دو ہزار ستر (۲۰۷۰) تھی جن میں بجز چند کے سب آزاد کر دئے گئے یہ خون آدم کے احترام کا درخشاں باب ہے۔[2]

عہد جدید کی جنگوں کا حال اس سے بالکل مختلف ہے، نہ صرف نوعیت کے اعتبار سے، تباہ کاریوں کے اعتبار سے، بلکہ نتائج کے لحاظ سے بھی۔ عہد جدید کی جنگوں میں جنگی مقتولوں کی تعداد لاکھوں اور کڑوروں تک پہنچتی ہے، ان گنت جنگی قیدی بنائے جاتے، جن کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا جاتا، املاک تباہ و برباد کر دی جاتی تھیں۔ صرف

ہیروشیما اور ناگاساکی میں ساڑھے تین لاکھ سے زائد بے گناہ افراد کو موت کے منہ میں اتارا گیا۔[۳] ایک ایٹم بم کی تباہ کاری سو سالہ اسلامی فتوحات کے مجموعی جانی نقصان سے کہیں زیادہ ہے۔ پھر آپؐ کی وفات کے بعد صرف پندرہ سال کے عرصے میں تین براعظموں اور تین بحر اعظموں پر مسلمانوں کی حکومت کا قائم ہو جانا، یہ تمام اور دیگر امور ہمیں عہد نبوی کی جنگوں کے مطالعے کا شائق بنا دیتے ہیں۔ یہاں اسلامی فتوحات کی تفصیلات ہمارا موضوع نہیں۔ بلکہ ہمیں اسلامی فتوحات پر اس زاویہ سے نظر ڈالنی ہے کہ اس کا مسلمانوں کی عقلی اور دینی زندگی سے کہاں تک تعلق تھا۔ اور آیا یہ اسلامی عسکری تعلیمات آج کے دور کے تقاضوں اور ضروریات کو بھی پورا کرتی ہیں یا نہیں۔

قتال بالحق کا مفہوم:

ہجرت رسول ﷺ کو دوسرا سال تھا کہ ۱۲، صفر ۲ھ (۱۴، اگست / ۶۲۳ء) کو قتل بالحق کا حکم نازل ہوا،[۴] تفسیر ابن جریر کی رو سے قتال کے بارے میں پہلی آیت یہ نازل ہوئی: "اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔[۵]

اگلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ: "انسے لڑو جہاں بھی تمہارا مقابلہ پیش آئے اور انھیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے، اس لیے کہ قتل اگرچہ برا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا"۔[۶]

جہاد لفظ "جہد" سے مشتق ہے جس کا مقصد سورۃ بقرہ میں واضح کر دیا گیا کہ: "اگر اللہ بعض لوگوں کے شر وفساد کو، بعض لوگوں کے ہاتھوں سے دفع نہ فرمادیتا تو تمام دنیا میں فساد پھیل جاتا"۔[۷]

اصطلاح شریعت میں جہاد کا مطلب یہی ہے کہ اپنی پوری قوت وطاقت کو اللہ کی راہ میں صرف کر دینا۔ مجاہد کا رضائے الٰہی کی خاطر جان وتن کا نذرانہ مرتبہ شہادت ہے۔ لیکن اگر مقصود توسیع مملکت، مال، نام یا اظہار طاقت ہو تو وہ جہاد نہیں بلکہ حرب بن جاتا ہے۔ قرآن میں جہاد کے لیے لفظ "قتال بالحق" استعمال ہوا ہے، جس کا اولین مقصد حق کی سربلندی ہے۔ یہ ایک فلاحی حربہ ہے جو نوع انسانی کو شر اور فساد سے بچاتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ قتال نظریات کے خلاف ہوتا ہے، افراد کے خلاف نہیں۔ ہندومت، یہودیت، عیسائیت، اشتراکیت وغیرہ نظریات ہیں۔ مشرک، بت پرست اور ملحد نظریہ اسلام کے کھلے دشمن ہیں، یہود ونصاریٰ کے بارے میں تاریخ شاہد ہے اور جس کی تصدیق قرآن بھی کرتا ہے کہ دو امتیں ہمیشہ فتنہ وفساد اور جبر وظلم کی ذمہ دار رہی ہیں۔ سورۃ المائدہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> "اے لوگو! جو ایمان لائے، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ یہ تو آپس میں ہی ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیقبناتا ہے تو اس کا شمار پھر انہی میں ہے یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے"۔[۸]

آگے چل کر فرمایا: "دنیا میں تم ایمان والوں کا شدید ترین دشمن یہودیوں اور مشرکوں ہی کو پاؤ گے"۔[۹]

لہٰذا جہاد و قتال فرض کر دیا گیا تا کہ دنیا کو شر و فساد سے محفوظ رکھا جا سکے یہ جہاد انبیاء سابقین پر بھی فرض کیا گیا اور رسول اللہ کی امت پر بھی۔ انبیاء کرام کی تاریخ کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ صرف چند رسولوں نے لڑائیاں لڑی ہیں۔ قرآن میں اختصار کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشرکوں سے معرکے کا ذکر ملتا ہے:

"پھر جب ان (بنی اسرائیل) پر جہاد فرض کیا گیا تو ان میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا سب پیٹھ دکھا گئے۔ اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے بے خبر نہیں"۔[10]

دوسرے پیغمبر حضرت داؤد ہیں جنہوں نے میدان جنگ میں بنی اسرائیل کے بادشاہ شاہ طالوت کی طرف سے لڑتے ہوئے داد شجاعت دی، قرآن اس کا تذکرہ سورۃ بقرہ میں کرتا ہے۔

اور جب وہ (مجاہدین) جالوت اور اس کے لشکر کے مقابل ہوئے تو کہنے لگے: "اے پروردگار! ہم کو صبر دے اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور کافر قوم پر ہم کو فتح و نصرت عطا فرما۔ پس اللہ کے حکم سے انہوں نے اُن (فلسطینیوں) کو شکست دے دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔ اور اللہ نے داؤد کو حکومت اور حکمت عطا فرمائی اور جو مناسب جانا وہ سب کچھ سکھایا"۔[11]

اور تیسرے گھمسان کی جنگیں[12] لڑنے والے خاتم النبیین رسول اللہ ﷺ ہیں، جن کا ارشاد ہے کہ "مجھے تلوار دے کر بھیجا گیا یہاں تک کہ تمام عبادت تنہا اللہ ہی کے لیے ہونے لگے اور میرا رزق میرے نیزے کے سائے کے نیچے رکھا گیا ہے"۔[13]

رسول اللہ کو اپنے ۲۳ سالہ دور نبوت میں کئی بڑی طاقتوں سے سابقہ پڑا، داخلی طور پر عرب کے بت پرست اور مشرک ایک بڑی طاقت تھے۔ دوسری بڑی طاقت یہودیوں کی تھی جن سے مدنی زندگی میں معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ اس کے علاوہ اس دور میں دو سپر پاور بھی تھیں۔ ایک رومن امپائر جن کا بادشاہ قیصر روم کہلاتا تھا، جب کہ دوسری سپر پاور دولت عجم کی تھی، جن کے شہنشاہ کا لقب کسریٰ تھا۔ یہ عراق کے بڑے حصے پر قابض تھے، گویا بت پرست، یہودی اور عیسائی یہ وہ بڑی طاقتیں تھیں جن کے خلاف مدنی دور (۱۰ سال) میں ۵۶ سرایا، ۲۷ غزوات، اور ۴ قتال ہوئے۔[14]

سیرت طیبہ کے طالب علم کے لیے تاریخ کی یہ مماثلت بڑی حیرت انگیز ہے کہ جو قوتیں عہد رسالت میں موجود اور برسرپیکار تھیں آج بھی باقی ہیں اور دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں سے دست و گریباں بھی ہیں۔ مثلاً عہد رسالت میں عرب کے بت پرستوں نے یہودیوں کے ساتھ مل کر محاذ بنایا اور دونوں طاقتیں کئی دفعہ متحد ہو کر مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے آپس میں خفیہ معاہدے بھی کیے اور کھلم کھلا جنگی مقابلے بھی۔ بعینہٖ آج بت پرست بھارت، قریش مکہ کی طرح مملکت پاکستان کے نقش وجود کو مٹا دینا چاہتا ہے اور اس مقصد کے

حصول کے لیے اسرائیل سے اس کا گٹھ جوڑ اور سازشی تعلق کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اسی طرح عہد رسالت کا عیسائی دشمن آج بھی مسلمانوں کے درپے آزار ہے۔ عراق کو تباہ کرنے کا منصوبہ ہو یا لبنان، افغانستان، بوسنیا اور کوسوا وغیرہ میں عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف قیامت صغریٰ برپا کر رکھی ہے۔ عین عرب دنیا کے قلب میں یہود و نصاریٰ کی سازشوں سے ۱۹۴۸ میں اسرائیل وجود میں آچکا ہے اور اس کی چیرہ دستیاں دنیا کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔

چنانچہ جس طرح رسول اللہ کو قتال بالحق کی ہدایت کی گئی کہ دنیا کو شر و فساد سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اسی طرح یہ فرض آج بھی مسلمانوں پر عائد ہے کہ وہ دنیا کو شر وفساد سے محفوظ رکھنے، اور دشمنان اسلام سے اپنے آپ کو اور اپنے دین کو محفوظ رکھنے کے لیے جہاد کا راستہ اختیار کریں۔ جہاد کی ہدایت کی گئی تو ان کو ضابطہ جنگ اور دفاعی حکمت عملی بھی سکھائی گئی۔ جن میں زمانے کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لیے لچک بھی پائی جاتی ہے۔ جن پر عمل کر کے کامیابی حاصل کرنا نہ صرف اس دور میں یقینی تھا بلکہ آج بھی یقینی ہے۔ بظاہر یہ بات ماورائے عقل معلوم ہوتی ہے کہ اس دور میں دی گئی ہدایات تیروں، تلواروں، نیزوں اور پتھروں کے لیے تھیں، جبکہ آج کا دور ایٹمی دور ہے جس میں دور مار تیروں کی جگہ میزائل استعمال ہوتے ہیں۔ ایک تیر ایک شخص کی جان لے سکتا تھا جب کہ ایک میزائل سینکڑوں افراد کی موت بن جاتا ہے۔ پھر آج کل جنگ صرف زمین پر ہی نہیں لڑی جاتی بلکہ فضاء اور سمندر بھی اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں۔ جدید ترین ایٹمی ہتھیاروں نے دنیا کو موت کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ان تمام حقائق کے باوجود بہر حال یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن پاک میں دی گئیں جنگی ہدایتوں اور اصولوں کا اطلاق، آج کی جدید ایٹمی جنگوں پر بھی کیا جا سکتا ہے اور کم و بیش وہی یقینی نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں جو اسلام کے ابتدائی عہد میں حاصل کیے گئے۔

عہد رسالت میں پیش آنے والے غزوات کو اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ تمام کی تمام جنگیں دفاعی نوعیت کی تھیں اور اسلامی نظریہ جہاد وقتال کا عملی نمونہ بھی ان غزوات کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اول: رسول اللہ (ﷺ) کی وہ جنگیں، جو فتح مکہ سے قبل کفار قریش سے تھیں۔ ان میں ہمیں رسول اللہ (ﷺ) کی حکمت عملی مدافعانہ نظر آتی ہے یہ تمام کی تمام جنگیں مسلمانوں اور دین اسلام کے دفاع میں تھیں۔

دوم: رسول اللہ کی (ﷺ) وہ جنگیں جو فتح مکہ کے بعد اس وقت کی سپر پاورز کے خلاف تھیں۔ ان میں گو کہ رسول اللہ (ﷺ) کا رویہ جارحانہ نظر آتا ہے کہ اب وہ خود پیش قدمی کر کے دشمن کے علاقے تک جاتے ہیں اور ان کو انہی کے علاقوں میں گھیر لیتے ہیں، لیکن نوعیت کے لحاظ سے یہ بھی دفاعی جنگیں ہی کہلائیں گی۔ اسلام کے فلسفہ

جنگ کو سمجھنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ ظہور اسلام کے وقت مختلف علاقوں اور مذاہب میں رائج جنگی قوانین اور اصولوں سے واقفیت حاصل کرلی جائے۔

دور جہالت کے جنگی قوانین:

عربوں میں جنگ کی حیثیت ایک قومی پیشہ کی سی تھی۔ ذرائع معاش کی قلت، ضروریات زندگی کی کمیابی اور اجتماعی نظم وضبط کے فقدان سے عربوں میں جنگجوئی کی عادت اس قدر راسخ ہوگئی تھی کہ وہ قتل وخون ریزی اور لوٹ مار کو اپنی خصوصیات بلکہ مفاخر میں شمار کرنے لگے تھے۔ صدیوں تک شمشیر زنی اور مردم کشی کے کھیل میں مصروف رہنے کی وجہ سے ان کو خونخواری کا ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ اب خون ریزی کسی مقصد یا غرض کے لیے نہیں بلکہ مقصود بالذات بن گئی تھی۔[۱۵] قدیم عربوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس دو ذرائع ہیں ایک وہ داستانیں جو ایام العرب کے نام سے اہل عرب میں رائج تھیں، دوسرے شعراء عرب کا کلام جس میں وہ اپنی معاشرت، تہذیب، معاملات اور امیال وعواطف کی صحیح صحیح تصویریں کھینچتے تھے۔ مثلاً ابو الغول طہوی کہتا ہے کہ: وہ ایسے شہسوار ہیں کہ موت سے نہیں گھبراتے جبکہ شدید جنگ کی چکی چلتی ہے۔[۱۶]

وڈاک بن ثمیل المازنی کہتا ہے کہ:

> "وہ ایسی قوم ہیں کہ جب لڑائی اپنی کچلیاں نکال کر ان کو ڈراتی ہے تو وہ گروہ در گروہ اور تنہا تنہا اس کے مقابلے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں"۔[۱۷]

اس قسم کی مثالوں سے عرب کی شاعری بھی پڑی ہے، جو ان کے دور کی جنگی خصلتوں کو ظاہر کرتی ہے۔ ان کے لیے جنگ کے محرکات عموماً مال غنیمت کا حصول، احساس تفاخر، اپنے آپ کو زیادہ طاقتور، ممتاز اور معزز ثابت کرنے کے لیے، ہر قسم کے خطرات برداشت کرنے پر آمادہ رکھتا تھا، اس کے علاوہ انتقام ایک ایسا شدید جذبہ تھا جو بار بار جنگوں کی آگ بھڑکا دیتا تھا اور سالہا سال کے لیے خونریزی کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ مقتول کی روح پرندہ بن کر اڑ جاتی ہے اور جب تک اس کے خون کا انتقام یا بدلہ نہ لے لیا جائے وہ کوہ وبیابان میں اسقونی، اسقونی (مجھے پلاؤ، مجھے پلاؤ) کہہ کر چیختی پھرتی ہے۔ ان کی اصطلاح میں اس پرندے کا نام ھامہ یا صداء تھا۔[۱۸]

مقاصد جنگ کی طرح ان کے جنگ کرنے کے طریقے بھی انتہا درجہ کے وحشیانہ تھے۔ کسی قوم کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے معنی ان کے نزدیک یہ تھے کہ جس طرح ممکن ہو اس کو مکمل تباہ وبرباد اور ذلیل وخوار کیا جائے اور ان کا یہ جذبہ اخلاقی حدود سے ناآشنا تھا۔ جنگ میں مقاتلین اور غیر مقاتلین کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا، دشمن قوم کے ہر فرد کو دشمن سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ عورتیں، بچے، بوڑھے بیمار کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ دشمن کو ایذا دینے کا حق غیر محدود تھا، زندہ آگ میں جلا ڈالنا، جنگی قیدی بنا کر جانوروں سے بدتر سلوک کرنا، اپنی منت یا قسم پوری

کرنے کے لیے سیکڑوں بے گناہ افراد کو آگ کی نذر کر دینا معمولی بات تھی[19] پھر ان کی جنگوں کے سنہرے اصول بھی وحشیانہ ہی تھے مثلاً غفلت میں دشمن پر کاری حملہ کرنا، رات کے وقت حالت خواب میں دشمن پر حملہ کرنا، لاشوں کا مثلہ کرنا اور جنگ کی حالت میں ہر قسم کی بد عہدی کرنا، جائز تھے۔

یہ تو عرب جاہلیت کا حال تھا مگر اس زمانے کی مہذب قوموں کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ قدیم زمانے کی سب سے زیادہ تہذیب یافتہ سلطنتیں دو تھیں۔ ایک روم، دوسرے ایران۔ تہذیب و تمدن، علوم و آداب اور شان و شوکت، ہر اعتبار سے اُس دور کی ممتاز اقوام تھیں۔ مگر ایک دوسرے سے، سب سے زیادہ بر سرپیکار رہتی تھیں اس کی وجہ ان کے درمیان سیاسی اختلاف کے ساتھ ساتھ مذہبی اختلافات بھی تھے۔ مذہبی بنیادوں پر انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بہیمانہ اور وحشیانہ سلوک کیا،[20] حد یہ کہ وہ ایک دوسرے کے سفراء کی بھی جان کے درپے ہوتے تھے، عہد وپیمان کے احترام پر حملہ کرنے میں یہ مہذب قومیں چنداں کم حوصلہ نہ تھیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی قیاصرۂ روم یا اکاسرۂ فارس نے اپنے دشمن کو نازک حالت میں دیکھا تو معاہدات کو بالائے طاق رکھ کر اس پر حملہ کر دیا۔ روم اور ایران کا فوجی نظام بھی کچھ اس طرح کا تھا کہ اس میں اخلاقی حدود کی پابندی نہیں ہو سکتی تھی۔ ان میں فوجی تربیت، آداب جنگ کی تعلیم اور عسکری نظم وضبط کے قائم رکھنے کا کوئی بندوبست نہ تھا، جنگ کے موقع پر عام جنگجو باشندوں کا ایک انبوہ اُمڈ کر چلا آتا تھا۔ قتل اور خون کے کھیل سے وہ صرف اس شوق میں نہ گھبراتے تھے کہ ہمسایہ ملکوں کو لوٹیں، مال و دولت کا حصول، خدمت کے لیے لونڈی وغلام اور عیش کوشی کے لیے خوب صورت لڑکیاں حاصل کریں۔ خود ان کے فرماں رواؤں کے سامنے بھی جنگ کا کوئی اخلاقی نصب العین نہ ہوتا تھا۔ وہ محض فتوحات اور مال وزر کے نشے میں چور ہوتے تھے۔[21]

یہ تھی وہ دنیا جس میں اسلام نے اصلاح کا علم بلند کیا۔ اسلام کا نظریہ یہ تھا کہ جنگ و قتال فی الاصل ایک معصیت ہے جس سے ہر انسان کو اجتناب کرنا چاہیے، لیکن جب دنیا میں اس سے بڑی معصیت یعنی ظلم، فتنہ و فساد پھیل گیا ہو تو محض دفع شر وفساد کے لیے جنگ کرنا ضروری ہی نہیں، بلکہ فرض ہے۔ اس پاکیزہ تصور کے ماتحت اسلام نے جنگ کا ایک مکمل ضابطہ قانون وضع کیا جس میں جنگ کے آداب، اس کے اخلاقی حدود، محاربین کے حقوق وفرائض، مقاتلین اور غیر مقاتلین کا امتیاز اور حقوق، معاہدین کے حقوق، سفراء اور اسیران جنگ کے حقوق، مفتوح قوموں کے حقوق، تفصیل کے ساتھ بیان کیے۔

اسلام کا فلسفہ جنگ و قتال:

انسانی تمدن کی بنیاد جس قانون پر قائم ہے۔ اس کی سب سے پہلی دفعہ یہ ہے کہ انسان کی جان اور اس کا خون محترم ہے۔ انسان کے تمدنی حقوق میں اولین حق زندہ رہنے کا حق ہے اور اس کے تمدنی فرائض میں اولین فرض زندہ رہنے دینے کا فرض ہے۔ دنیا کی جتنی شریعتیں اور مہذب قوانین ہیں ان سب میں احترام نفس کا یہ اخلاقی اصول ضرور موجود ہے۔ جن کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے عموماً سزا کے خوف اور قوت کے زور سے کام لیا جاتا ہے۔ جب کہ ایک سچے مذہب کا کام دلوں میں اس کی صحیح قدر و قیمت پیدا کر دینا ہے تاکہ جہاں سزا اور پولس کا خوف نہ ہو وہاں بھی بنی آدم خون ناحق سے محترز رہیں۔ اس نقطہ نظر سے احترام نفس کی صحیح ترین اور موثر تعلیم اسلام کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔

اسلام جس دور تاریک میں اترا اس کی وحشتوں اور خونخواریوں کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ ایسے تاریک دور میں اسلام نے آواز بلند کی کہ: "یعنیا انسانی جان کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس کو قتل نہ کرو مگر اس وقت جب کہ حق اس کا مطالبہ نہ کرے"۔ [۲۲]

اس آواز میں قوت تھی، عقل اور فطرت سے مطابقت تھی اس لیے دنیا کے گوشہ گوشہ میں جا پہنچی، اور اس نے انسان کو اپنی جان کی صحیح قیمت سے آگاہ کیا اور افراط اور تفریط کی دوراہوں کے درمیان عدل کی سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کی۔ ایک طرف وہ مسرف اور حد سے تجاوز کرنے والا گروہ ہے۔ جو انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا اور اسے اپنی نفسانی خواہشات پر قربان کر دینا جائز سمجھتا ہے۔ دوسری طرف وہ غلط فہم گروہ ہے، جو خون کے تقدس اور حرمت کا ابدی قائل ہے اور کسی حال میں بھی اسے بہانا جائز نہیں سمجھتا۔ اسلامی شریعت نے ان دونوں غلط خیالوں کی تردید کی اور واضع طور پر بتایا کہ کب انسانی جان محترم ہے اور کب واجب القتل ہے۔ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ ایک چیز انسانی جان سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور وہ "حق" ہے۔ انسان جب تک حق کا احترام کرتا ہے اس کا خون واجب الاحترام رہتا ہے۔ مگر جب وہ سرکشی اختیار کر کے "حق" پر دست درازی کرتا ہے تو اپنے خون کی قیمت خود کھو دیتا ہے۔ پھر اس کا خون پانی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ [۲۳] یہ قتل بالحق اگرچہ صورت میں قتل بغیر حق کی طرح خونریزی ہی ہے مگر حقیقت میں یہ ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بغیر دنیا میں نہ تو امن قائم ہو سکتا ہے نہ شر و فساد کی جڑ کٹ سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا تو صومعے اور گرجے اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ مسمار کر دیئے جاتے"۔ [۲۴]

یہ فتنہ و فساد انفرادی نوعیت کا بھی ہوتا ہے اور اجتماعی نوعیت کا بھی، نوعیت کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں لیکن کیفیت کے اعتبار سے بڑا فرق ہے۔ افراد کا فتنہ ایک تنگ دائرے میں ہوتا ہے اور انسانوں کی ایک

قلیل جماعت کو اس سے آزار پہنچتا ہے۔ مگر جماعتوں کا فتنہ ایک لامحدود مصیبت ہوتا ہے، جس سے بے شمار لوگوں کی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ جماعتیں جب سرکشی پر آتی ہیں تو ان میں شیطانی عوامل بڑی تعداد میں شامل ہو جاتے ہیں اور جب ان شیطانی کاموں کے ساتھ "اکراہ فی الدین" بھی شامل ہو جائے اور ظالم جماعت اپنی اغراض کے لیے مذہب کو استعمال کر کے بندگان خدا کو مذہبی آزادی سے محروم کر دے اور ظلم و ستم کرے تو یہ مصیبت اور بھی سوا ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں جنگ جائز ہی نہیں بلکہ فرض ہو جاتی ہے، اس وقت انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہوتی ہے کہ ان ظالموں کے شر سے اللہ کے مظلوم و بے بس بندوں کو نجات دلائی جائے۔ قتال کے بارے میں قرآن کی سب سے پہلی آیت جو نازل ہوئی اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:"جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے انھیں لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے، اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بے قصور نکالے گئے ہیں۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے"۔[۲۵]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے خلاف جنگ کا حکم دیا ہے ان کا قصور یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کے پاس ایک زرخیز ملک ہے، وہ تجارت کی ایک بڑی منڈی کے مالک ہیں، یا دوسرے مذہب کی پیروی کرتے ہیں۔ بلکہ صاف طور پر بتایا گیا کہ جنگ ان کے خلاف کرنی ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں، لوگوں کو بے قصور ان کے گھروں سے نکالتے ہیں اور اس قدر متعصب ہیں کہ محض اللہ کو رب کہنے پر تکلیف پہنچاتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے مدافعت میں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ کمزوروں اور بے بسوں کو ظالموں کے پنجے سے چھڑاؤ۔

> "تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں اُن کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم اور جفاکار ہیں اور ہمارے لیے خاص اپنی طرف سے ایک محافظ اور مددگار مقرر فرما"۔[۲۶]

ایسی جنگ کو جو ظالموں اور مفسدوں کے مقابلے میں اپنی مدافعت اور کمزوروں اور بے بسوں کی اعانت کے لیے کی جائے اللہ نے خاص راہِ خدا کی جنگ یعنی جہاد فی سبیل اللہ قرار دیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ جنگ بندوں کے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے ہے اور یہی وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے جس کی فضیلت سے قرآن پاک کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ اسی کو حق پرستی کی جنگ قرار دے کر کامیابی اور بلند درجات کی نوید دی گئی ہے اور اس سے منہ پھیر کر گھروں میں بیٹھ رہنے والوں کے لیے سخت تنبیہ کی۔ قرآن پاک لوگوں کو صرف دوراہیں بتاتا ہے یا موت، یا شرف، زندگی بے شرف کی تیسری راہ اس نے نہیں بتائی اور جو ایمان کی کمزوری یا حوصلہ کی کمی کی وجہ سے اس کو اختیار کرتا ہے تو قرآن اس کی زندگی کو "ذلت" اور "مسکنت" قرار دیتا ہے۔

جن لوگوں کی روحوں کو فرشتوں نے اس حال میں ضبط کیا کہ وہ خود اپنے نفس پر ظلم "کر رہے تھے تو انھوں نے ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں جی رہے تھے؟ انھوں نے کہا کہ ہم زمین میں کمزور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس جگہ کو چھوڑ کر نکل جاتے؟ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت ہی بری جائے قرار ہے"۔[۲۷]

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے سب معاملات میں تحمل اور برداشت کی تعلیم دی مگر ایسے کسی حملے کو برداشت کرنے کی تعلیم نہیں دیتا جو دین اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے لیے ہو، بلکہ وہ یہاں واضح طور پر قتال بالحق کا حکم دیتا ہے۔ گویا یہ طے ہے کہ یہ تمام جنگیں جن کا حکم دیا جارہا ہے مدافعانہ جنگیں ہیں۔ ان جنگوں کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ یعنی حملے کی صرف یہی صورت نہیں کہ ایک سلطنت باقاعدہ اعلان جنگ کر کے دارالاسلام پر حملہ کرے۔ اس کے علاوہ بھی کئی صورتیں ہیں جس سے ایک قوم کے امن واطمینان اور اجتماعی زندگی کو خطرے میں ڈالا جاسکتا ہے مثلاً:

۱۔ ظلم وتعدی کے جواب میں جنگ کرنا جائز ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں یعنی براہ راست مسلمانوں پر حملہ کیا جائے۔ مسلمانوں کی جان ومال کو لوٹیں، ان کو بے گھر کریں، یا مذہبی عقائد کو بنیاد بنا کر ان پر تشدد کیا جائے۔ تو مسلمانوں کو ان ظالموں کے خلاف جنگ کا حکم دیا گیا۔

۲۔ صد عن سبیل اللہ یعنی اللہ کے راستے سے روکنا بھی ایک ایسا جرم ہے جس کے خلاف جنگ ضروری ہو جاتی ہے۔ اس کی بھی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً اسلام قبول کرنے سے لوگوں کو روکنا، مسلمانوں کو زبردستی مرتد بنانے کی کوشش کرنا، یا اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا دشوار بنا دینا۔ وغیرہ

۳۔ بدعہدی اور عہد شکنوں کو سخت وعید سنائی گئی اور قرآن میں صاف حکم آ گیا کہ وہ لوگ جو معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہیں، یا وہ کفار جو مسلمانوں سے اطاعت کا وعدہ کر کے حکومت اسلامیہ کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ ان سے کھلی جنگ ہے۔

۴۔ ان بیرونی دشمنوں کے علاوہ کچھ اندرونی دشمن بھی ہیں جو ظاہر میں دوست مگر باطن میں اسلام کی جڑ کاٹنے والے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے قرآن نے منافق کا لفظ استعمال کیا اور ان کے خلاف جہاد کا حکم دیا گیا۔

۵۔ دشمنوں کی ایک قسم فسادی ہے جو اندر بیٹھ کر یا باہر سے آ کر سلطنت میں فساد پھیلاتی ہے اور امن وامان میں خلل پیدا کرتی ہے۔ ان کے بارے میں قتال کا حکم آیا۔

۶۔ مسلمانوں کی کوئی جماعت جو اپنی کمزوری یا بیچارگی کے باعث دشمنوں کے پنجہ میں گرفتار ہو جائے تو ایسے مظلوم مسلمانوں کی حمایت کے لیے تلوار اٹھانے کا حکم آیا۔

۷۔ اور سب سے آخر میں جس مقصد کے لیے حکم قتال دیا گیا وہ یہ ہے کہ اپنی قوت کو مٹنے سے محفوظ رکھنے کے بعد، اس محفوظ شدہ طاقت کو تمام دنیا سے فتنہ و فساد کے مٹانے اور مفسدوں سے فساد کی قوت چھین کر انھیں نیکی کا تابع بنانے میں استعمال کرو۔[۲۸]

یہ ہے اسلام کا فلسفہ جنگ کہ اسلام کن صورتوں میں جنگ کو جائز اور فرض قرار دیتا ہے اس کے علاوہ جہاں گیری، انتقام، حرص غنیم، یا تفاخر کے لیے کی جانے والی جنگوں کو پسند نہیں فرماتا اور ایسا کرنے والوں کو آخرت کے عذاب سے ڈراتا ہے۔

پھر مقصد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ طریق حصول مقصد کی بھی اصلاح کی گئی اگر نفس مقصد مکروہ ہو تو خواہ اس کو کتنے ہی شریفانہ طریقے سے حاصل کیا جائے وہ بہر حال مکروہ ہی رہے گا اور اگر مقصد فی نفسہٖ نہایت اشرف و اعلیٰ ہو لیکن اسے حاصل کرنے کے طریقے پایہ شرافت سے گرے ہوئے ہوں تو مقصد بھی داغ دار ہو جائے گا۔ پس ایک جائز اور حق پرستانہ جنگ کی تعریف یہ ہے کہ اس کا مقصد اور طریق حصول مقصد دونوں پاکیزہ، اشرف اور اعلیٰ ہوں۔ چناچہ رفتہ رفتہ ان تمام وحشیانہ حرکات کو روک دیا جو جاہلیت کی لڑائیوں میں کی جاتی تھیں۔ مثلاً محاربین کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ اول مقاتلین اور دوم غیر مقاتلین۔ مقاتلیں کو قتل کرنے کی اجازت دی گئی (ان میں وہ عورتیں بچے یا بوڑھے شامل سمجھے جائیں گے جو جسمانی طور پر شریک جنگ ہوں یا نہ ہوں مگر عملی طور پر دشمن کا ساتھ کسی نہ کسی طور دے رہے ہوں) مگر غیر مقاتلین کی جان نہیں لی جا سکتی۔ ساتھ ہی مقاتلین کے حقوق بھی متعین کیے گئے اور ان پر غیر محدود دست درازی کا حکم نہیں دیا گیا اور چند چیزوں کی سختی سے ممانعت کی گئی۔ مثلاً غفلت میں حملہ کرنے کی ممانعت (اس کی معروف شکل شب خون کی ہے)

قیدی بنانے کے بعد قتل صبر (باندھ کر مارنے) کی ممانعت۔ لوٹ مار کی ممانعت۔ تباہ کاری کی ممانعت۔ قتل اسیر اور قتل سفیر کی ممانعت۔ بد عہدی کی ممانعت۔ وحشیانہ افعال کی ممانعت[۲۹]

ان اصلاحی تعلیمات کا ہی اثر تھا کہ ۸ سال کی قلیل مدت میں عظیم الشان نتائج سامنے آئے اور ان کا بہترین نمونہ فتح مکہ ہے۔ انھی تعلیمات کو جب خلفائے راشدین لے کر آگے بڑھے تو عظیم الشان فتوحات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس دور کے مفتوحہ علاقے آج چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی (کم و بیش) مسلمان علاقے ہیں۔ اس کے برعکس دیگر فاتحین اعظم کو دیکھیے تو وہ اپنے پیچھے تباہ کاریوں، خونریزیوں اور انسانی کھوپڑیوں کے مینار تو چھوڑ گئے مگر اپنا یا اپنی قوم کے اثرات مرتب نہ کر سکے۔ ان کے مفتوحہ علاقوں میں آج ان کا نام لیوا کوئی نہیں۔ مسلمانوں کی ان حیرت انگیز عسکری کامیابیوں کے پیچھے انسانی عقل و فہم سے زیادہ الہامی ہدایات تھیں، جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم فرمائیں اسی لیے ان کے اثرات بھی دیرپا اور مکمل تھے۔ حق و باطل کے پہلے فیصلہ کن

معرکے غزوہ بدر کے بعد سورۃ انفال نازل ہوئی اس میں مال غنیمت کی تقسیم کے علاوہ دشمنوں سے بنرد آزما ہونے کی زریں ہدایات بھی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی کہ:

۔۔۔"اور تم لوگ جہاں تک بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے تیار رکھو"۔[۳۰]

۔۔۔"اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں"۔[۳۱]

۔۔۔"اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں۔ ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔[۳۲]

۔۔۔"اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہر گز ظلم نہ ہو گا اور (اے نبیؐ) اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو، یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہوں تو تمہارے لیے اللہ ہی کافی ہے"۔[۳۳]

ان ہدایتوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو وارننگ بھی دی:

۔۔۔"کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے غافل ہو جاؤ تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں"۔[۳۴]

رسول اللہ کی عسکری حکمت عملی:

گویا جنگی حکمت عملی بھی اللہ تعالیٰ نے تعلیم فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ جو مجسم قرآن پاک کی تفسیر تھے، اُن کے قتال بھی انہی حکمتِ عملیوں پر مبنی تھے۔ جنگی حکمت عملیوں کے لیے احادیث کا ایک بڑا ذخیرہ بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اپنے موضوع کی مناسبت سے یہاں غزوات رسول ﷺ کی تفصیلات سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم رسول اللہ ﷺ کی جنگی حکمت عملیوں پر نظر ڈالتے ہیں۔

- سب سے پہلا حکم اسباب طاقت جمع رکھنے کا ہے، ایسا نہ ہو کہ خطرہ سر پر آجائے اور تیاری بعد میں شروع ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اور تیار رکھو ان کے لیے جو تم سے ہو سکے۔ قوت سے آگاہ رہو کہ قوت الرمی میں ہے۔ صحابہ کرام نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ الرمی سے کیا مراد ہے؟ فرمایا وہ ہتھیار جسے بہت دور سے دشمن پر پھینک کر اسے نقصان پہنچایا جا سکے"۔[۳۵] عہد رسالت میں ایسا ہتھیار تیر تھے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے ہر مجاہد کو

مسلح دیکھنا چاہتے تھے۔ لہذا اسلحہ اور سامان جنگ کے مہیا کرنے میں ہر مسلمان ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا۔

- اجتماعی عسکری تربیت کے بغیر افواج کا جنگ جیتنا ناممکن ہے۔ لہذا فوجوں کی اجتماعی تربیت اس کا لازمی حصہ ہے رسول اللہ ﷺ نے اس پر عمل کیا اور مسلمانوں کی تربیت اس طرح کی کہ مسلمان ہونے والا ہر شخص اسلامی فوج کا حصہ بن جاتا تھا۔ آپؐ نے ان کی اجتماعی تربیتکا بھی بندوبست کیا اور غزوہ بدر سے پہلے ہی آپ نے صحابہ کرام کو مختلف سمتوں یعنی ساحل سمندر سے گزرنے والے تجارتی راستے مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے درمیاں بسنے والے موئثر اور معتبر قبائل اور مکہ مکرمہ اور نجد کے درمیان گزرگاہ پر ایسے مقامات کی طرف جو فوجی نقطہ نظر سے نہایت اہم تھے، عسکری ذمہ داریاں سونپ کر روانہ کیا[۳۶] یہ تمام علاقے پہاڑی، صحرائی، میدانی یا بیک وقت صحرائی اور پہاڑی تھے۔ اس کے علاوہ یہ علاقے آب وہوا کے لحاظ سے سخت ہونے کے ساتھ ساتھ دشوار گزار تھے۔ ذمہ داریوں کا مقصد جہاں ان کی جسمانی اور معنوی تیاری تھا وہاں مختلف موسموں اور علاقوں میں سپاہ کی اجتماعی تربیت بھی مقصود تھی تاکہ بوقت ضرورت جغرافیائی تغیر و تبدل، حصول مقصد کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں چناچہ یہی لوگ بعد میں سرحداتِ ہند سے لے کر مراکش تک گئے اور مختلف النوع جغرافیائی تبدیلیوں میں اپنے آپ کو آسانی سے ڈھالتے گئے۔
- میدان جنگ میں اترنے سے پہلے رسول اللہ ﷺ دشمن کے مکمل کوائف اور معلومات حاصل کر لیتے تھے تاکہ جنگ کے لیے مناسب منصوبہ بندی کی جائے۔ آپؐ کا طریقہ کار یہ تھا کہ طلایہ گرد دستہترتیب دیتے جو مدینہ منورہ سے باہر نکل کر دشمن اور حلیف قبائل کی صلاحیتوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے۔ رسول مقبول ﷺ کی یہ سنت تھی کہ آپؐ ایک ذریعہ سے حاصل شدہ معلومات کی تصدیق دوسرے ذریعہ سے ضرور کرلیا کرتے تھے تاکہ کسی غلطی کا احتمال نہ رہے اور موصولہ معلومات کی بھی تصدیق ہوسکے۔[۳۷]
- ہادی بر حق ﷺ نے اپنے صحابہؓ کی ایسی تربیت کی تھی کی مسلمانوں کی عسکری منصوبہ بندی کی کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔ آپؐ بعض معاملات میں صحابہؓ سے مشورہ کرتے مگر بعض معاملات کو عام صحابہؓ سے پوشیدہ رکھتے، یہاں تک کہ اسلامی افواج کی تحریک سے بھی یہ اندازہ نہ ہوتا کہ کس جانب کا ارادہ ہے۔ اسے توریہ کہتے تھے، توریہ[۳۸] کی ایسی مثالیں اور بھی کئی مواقع پر نظر آتی ہیں۔ عسکری رازوں کی حفاظت کے لیے رسول اللہ ﷺ نے خفیہ خط کا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ مختلف مرحلوں کی حکمت عملی کو پوشیدہ رکھا جائے۔ حضرت عبداللہؓ بن جحش کو دیا جانے والا خط جس کے متعلق انھیں ہدایت کی گئی تھی کہ دودن کے بعد کھولیں، اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ رازداری ناگہانی حملوں کے عوامل میں سب سے بڑا اور اہم عامل

ہے۔ آپؐ افواج کی تحریک کو اس قدر پوشیدہ رکھتے تھے کہ بسا اوقات دشمن کے سر پر پہنچ جاتے مگر ان کو خبر تک نہ ہوتی۔ فتح مکہ، غزوہ دومۃ الجندل اور غزوہ خیبر وغیرہ اس کی مشہور مثالیں ہیں۔

- ایک کامیاب قائد کی بہت بڑی خوبی ہوتی ہے کہ وہ دشمنوں کو ایسی جگہ لڑنے پر مجبور کرے جہاں دشمن کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ فائدے حاصل کیے جا سکیں اور دشمن کو ان فوائد سے محروم کر دیا جائے۔ عہد رسالت کی تمام جنگوں میں یہی اصول کار فرما نظر آتا ہے۔ بدر کے موقع پر میدان جنگ میں پہلے پہنچ کر مناسب جگہوں پر قبضہ کر کے دشمن کو جنگی سہولتوں سے محروم کر دینا، احد کے موقع پر پہاڑ کو اپنی پشت پر رکھ کر صف بندی کرنا اور اپنی پشت محفوظ کر لینا، جس طرف سے دشمن حملہ کر سکتا تھا وہاں پہلے ہی تیر اندازوں کو مقرر فرما دیا، اسی طرح غزوہ احزاب کے موقع پر مدینہ کے اطراف کھدی ہوئی خندق دیکھ کر ابو سفیان حیرت اور غصے سے چیخ اٹھا تھا، کیونکہ اسے رسول اللہ کی اس جنگی حکمت عملی کے سامنے اپنی عبرت ناک شکست صاف نظر آرہی تھی۔ اسی کو جنگی اصطلاح میں "پہل کاری" کہتے ہیں۔[۳۹]

- اتویں صدی کے اوائل تک میدان جنگ میں باقاعدہ صف بندی کا رواج نہیں تھا خود عرب کے اندر بھی منظم صف بندی کا تصور تک نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلی دفعہ فوج کو تین حصوں یعنی میمنہ، میسرہ اور ساقہ میں تقسیم کیا اور تینوں حصوں کے مابین رابطے کے لیے اونٹنی سوار مقرر کیے جو رسول اللہ ﷺ کی ہدایات ان تک پہنچاتے، اور یہ تینوں حصے دوران جنگ مرکز سے ملنے والی ہدایات کے مطابق ایک دوسرے کو مناسب مدد پہنچاتے رہے۔[۴۰] ماہرین فن حرب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صف بندی اس امر کی ضمانت ہے کہ احتیاطی طاقت سپہ سالار کے ہاتھ میں رہتی ہے جس سے وہ غیر متوقع صورتحال کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

- فوجی اصطلاح میں اچانک پن سے مراد یہ ہے کہ دشمن کو ناگہانی طور پر اس طرح جالیا جائے کہ اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملے۔ میدان جنگ میں دشمن کو اچانک پن سے دوچار کرنا اعلیٰ درجہ کی قیادت، نظم و ضبط اور اطاعتِ احکام کا مرہون منت ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی جنگی حکمت عملی میں اچانک پن کو بہت اہمیت حاصل تھی، اس کے حصول کے لیے جہاں دشمن کے متعلق صحیح معلومات ضروری ہوتی ہیں وہیں افواج کی سریع الحرکتی کو بھی بہت دخل ہوتا ہے۔[۴۱] سریع الحرکتی اور اچانک پن کی سب سے بہترین مثال فتح مکہ ہے کہ جب اسلامی افواج دشمن کی توقع کے برعکس اچانک بطن مکہ میں پہنچ گئیں تو کفار مکہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ کتب حدیث میں ابو سفیان اور اس کی بیوی ہندہ کے مکالمے نقل کیے گئے ہیں جس سے عیاں ہوتا ہے کہ اس اچانک پن کے نتیجے میں لوگوں کو یہ بھی سجھائی نہیں دیتا تھا کہ وہ کیا کریں اور کدھر جائیں۔ یہ تو ایک مثال تھی اس طرح کی مثالیں اسلامی تاریخ میں بہت ملیں گی۔ مثلاً غزوہ خیبر، غزوہ دومۃ الجندل یا بنو لحیان پر حملہ وغیرہ۔[۴۲]

- اسی طرح فوجی زندگی میں رات کے سفر کی بہت اہمیت ہے، دشمن سے اپنی افواج کی نقل و حمل، پوزیشن اور منصوبے چھپانے کے لیے اور دشمن کو اچانک پن سے دوچار کرنے کے لیے رات کے وقت افواج کی نقل و حرکت سے مطلوبہ نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں جیساکہ رسول اللہ ﷺ نے حاصل کیے۔
- میدان جنگ میں بدلتی صورتحال کے پیش نظر اگر اپنے منصوبوں میں مناسب تبدیلی نہ کی جائے تو دشمن کا پلہ بھاری ہو سکتا ہے اور وہ کسی بڑے نقصان سے دوچار کر سکتا ہے۔ چناچہ رسول اللہ ﷺ کے منصوبوں میں بھی لچک پزیری نظر آتی ہے اور ایسے واقعات نظر آتے ہیں کہ جیسے ہی صورتحال تبدیل ہوتی اسلامی افواج کے منصوبے کو اسی کے مطابق ڈھال دیا جاتا تھا اور یوں اپنے آپ کو بڑے نقصان سے محفوظ کر لیا جاتا۔ اس کی مثالیں غزوہ احد، غزوہ حنین اور غزوہ طائف سے دی جاسکتی ہیں۔[۴۳]

اپنی اور دشمن کی افواج کی نفسیات پر عبور رکھنا، سپہ سالار کی اضافی صلاحیت ہوتی ہے۔۔ اپنی افواج کے عزائم کو بلند رکھنا، سپاہیوں کا ہر حال میں وفادار رہنا، اور اپنی افواج کو ذہنی اور جسمانی طور پر اپنے طابع رکھنا، عموماً سپہ سالار اس میں کامیاب رہتے ہیں، مگر صلاحیت تو یہ ہے کہ دشمن کی افواج پر ایسے نفساتی حملے کیے جائیں کہ اس کی عسکری صلاحیتں متاثر ہوں اور میدان جنگ اپنے ہاتھ رہے۔ مثلاً:

الف) کم تعداد کے باوجود دلیرانہ میدان جنگ میں پہلے سے پہنچ جانا گویا آپ کے پاس زیادہ قوت و طاقت ہے اور حوصلے بلند ہیں۔

ب) دشمن کی صفوں میں ایسے عناصر سے رابطہ جو شدت پسند نہ ہوں اور دشمن کو حملے سے باز رکھیں۔

ج) ایک وقت میں ایک ہی دشمن سے مقابلہ کرنا۔ اور کوشش کرنا کہ دشمن کے حلیف اس جنگ سے دور ہی رہیں اس کے لیے عموماً معاہدات سے کام لیا جاتا۔

د) دشمن کو خوف میں مبتلا کرنا اور موقع ملتے ہی دور تک تعاقب کرنا۔ اور اس کی حوصلہ شکنی کر کے دوسرے حملہ سے خود کو محفوظ رکھنا۔

ہ) گوریلا کاروائیاں بھی دشمن کو رعب میں لے آتی ہیں، رسول اللہ ﷺ کے پاس افرادی قوت کم تھی مگر ان کی گوریلا کاروائیوں نے دشمن کو رعب اور خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔

شریعت اسلامیہ نے جنگ کے عملی پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو بھی ایک مضبوط قانون سے منضبط کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ اس نے جنگ اور متعلقات جنگ کے متعلق نئے مہذب قوانین وضع کیے، تو کچھ پرانے طریقوں کو وقت کی روح کے لحاظ سے ایک بدلی ہوئی شکل میں اگر باقی بھی رکھا تو بھی ان کے اندر بتدریج اصلاح پزیری کی ایک ایسی لچک پیدا کر دی کہ زمانے کی ترقی اور حالات کے تغیر اور انسانی افکار کی نشو نما کے ساتھ ساتھ ان میں خود بخود اصلاح ہو جائے۔ اسی طرح کچھ نئے اصول وضع بھی کیے جن میں ترقی کی صلاحیت رکھ دی کہ ہر زمانے کی ضرورت کے لحاظ

سے ان میں فروعی اور جزئی احکامات نکالے جا سکیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اصل ماخذ یعنی قرآن حکیم اور احادیث نبوی کی طرف رجوع کریں۔ اور ان میں جو اصول و فروع موجود ہیں ان سے اپنی آج کی ضروریات کے مطابق ایک ضابطہ قانون مدون کر لیں۔[۴۴] اس کی ضرورت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب جدید ذہنوں میں اس قسم کے سوالات اٹھنے لگیں کہ، آج صدیوں کی ترقی کے بعد جنگ کے متعلق جو نئے نئے قوانین وجود میں آ گئے ہیں اور انسانی افکار میں جو بلوغ پیدا ہو گیا ہے اس کا اُس عہد کے قوانین و افکار سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ جبکہ انسان کے قوائے فکر نسبتاً سفلی حالت میں تھے؟؟

ایسے سوالات کے جوابات کے لیے ضرورت ہے ایسے تقابل کی جو اسلام اور تہذیب جدید کا ہو، اور جو یہ متعین کرے کہ جنگ کے متعلق کس کے مقاصد و مناہج زیادہ صحیح، زیادہ مفید، مضبوط اور موثر ہیں۔ کسی مسئلہ میں انسانی جماعت کے عقائد اور طریقہ کار عموماً تین چیزوں سے معلوم ہوتا ہے۔ مذہب، ادبیات اور سوسائٹی کا طرز عمل۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تہذیب جدید نے اسے انسان کا شخصی معاملہ بنا دیا ہے اور موجودہ زمانے کی تمدنی زندگی کے معاملات پر اس کا کوئی قابو نہیں۔ جہاں تک ادبیات کا تعلق ہے بلاشبہ ان کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مغرب میں موجود ہے۔ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے مصنف کو بھی یہ فخر حاصل نہیں کہ اس کا کوئی قول اس کی قوم کے لیے قانون کی حیثیت رکھتا ہو۔ ہاں البتہ یہ ضرور ممکن ہے کہ اس کے اقوال سے متاثر ہو کر اس کی قوم نے اپنے لیے قوانین بنا لیے ہوں۔[۴۵] اور ان پر عمل شروع کر دیا ہو، یہی سوسائٹی کا طرز عمل کہلائے گا، جس کی ایک مثال میکیاویلی کی ہے۔ میکیاویلی تیرہویں صدی کا ایک ماہر سیاسیات تھا۔ جس نے سیاسی اخلاق کا ایک نیا مجموعہ تیار کیا تھا، جس کی بنیاد سیاسی مصلحت پر رکھی۔ اس کی تعلیمات انسانی فطرت کے انتہائی پست تصور پر مبنی ہیں۔ انسان شاید ایک حد تک ایسا ہی ہے جیسا کہ میکیاویلی کو نظر آتا ہے۔ "دھوکے باز، ناشکرا اور حریص"۔ میکیاویلی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اخلاقیات کے اصولوں کی سیاسی زندگی میں کوئی جگہ نہیں، لہذا چالبازی، دغا، فریب کے ہر ہتھیار سے سیاست میں کام لینا چاہیے، یہی کامیابی ہے۔ اس کے نزدیک اگر ریاست کی موت اور زندگی کا سوال ہو اور عام اخلاقی اصول بالائے طاق رکھنے سے کام نکل رہا ہو تو ایسا کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ یہی ایک اصول ہے جس کی پابندی فرض ہے۔[۴۶]

میکیاویلی کے دیے گئے نظریات پر آج کی تمام متمدن قومیں گامزن ہیں، خواہ وہ اسے کتنا ہی برا کیوں نہ سمجھتی ہوں، ان کی ادبیات میں ان کی مخالفت میں کچھ مہذب اصول لکھے ہوئے ہیں مگر عملاً اس وقت سب سے زیادہ مقبول نظریات میکاویلی کے ہی ہیں۔ اس کے یہ نظریات سولہویں صدی میں عالم شباب کو پہنچے، میکیاویلی بدنام ضرور ہوا مگر حکمرانی کرنے اور حکمرانی حاصل کرنے، دونوں کے جوجو، گر اُس نے بتائے اکثر حکمران اسی پر عمل پیرا رہے۔[۴۷] انیسویں صدی آئی تو میکیاولی کو خاص طور سے اطالیہ میں ایک نئے نقطہ نظر سے دیکھا جانے لگا، بعد ازاں

جرمنی میں اس کے مداح پیدا ہوئے اور ہوتے ہوتے اس کی تعلیمات قبولیت عام حاصل کر گئیں۔[۴۸] دوسری طرف اسلام کی تعلیمات بھلائی جانے لگیں جدیدیت کے نام پر سب مغرب کے پیچھے چل دیئے تو میکاولیت کے اثرات مسلمانوں پر بھی پڑنے لگے۔ جس کا خمیازہ مسلمانوں نے بار بار بھگتا، لیکن جہاں جہاں مسلمانوں نے جزبہ ایمانی زندہ رکھا آج بھی سپر پاورز کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اس کی مثال افغانستان میں روس کی عبرت ناک شکست، یا چھ اسلامی ریاستوں کی اشتراکیت سے آزادی، جن میں تاجکستان، ترکمانستان، کرغیزیہ، قازقستان، آذربائیجان، اور ازبکستان شامل ہیں۔[۴۹] لبنان پر اسرائیل کا حملہ اس کی بڑی مثال ہے جب جدید ہتھیار، جزبہ ایمان کے سامنے رنگ نہ لاسکے، خود پاکستان پر بھارت کا ۱۹۶۵ کا حملہ نہیں بھلایا جاسکتا، نوزائیدہ اسلامی ریاست پر کفار کا حملہ۔۔۔غزوہ بدر میں اللہ کی نصرت وحمایت مسلمانوں کے ساتھ رہی تو ۱۹۶۵ کی جنگ میں بھی اللہ کی نصرت وحمایت کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کے ساتھ رہی۔ صرف ایک جزبہ جہاد اور جوش ایمانی جب مسلمانوں کو آج تک اللہ کی مدد سے سرفراز رکھتی ہے، تو اگر مسلمان اسلام کے نظام دفاع و جہاد کو اپنا لیں اور رسول اللہ ﷺ کی عسکری حکمت عملیوں سے سبق حاصل کر لیں تو کیا وجہ ہے کہ مسلمان ایک بار پھر دنیا کی سپر پاور نہ بن سکیں۔

گزشتہ سطور میں قرآنی احکامات برائے جنگی حکمت عملی لکھے جاچکے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستانی افواج اپنے لیے چند اسباق اخذ کر سکتی ہے مثلاً سب سے اولین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ اسباب جنگ مہیار کھیں کہ یہی پہلا قرآنی حکم ہے، موجودہ دور میں اسباب جنگ درج ذیل ہوں گے۔

۔۔۔مستقل فوج جو ہر وقت الرٹ رہے۔

۔۔۔مختلف جغرافیائی ماحول میں مکمل عسکری تربیت اور جنگی مشقوں کا تسلسل

۔۔۔اسلحہ اور بارود کی خود کفالت، تاکہ توازن قوت برقرار رکھا جاسکے

۔۔۔دشمن کو خوفزدہ کرنے کے لیے اسلحہ کی نمائش، آج کی اصطلاح میں اسلحہ برائے امن

۔۔۔ایٹمی پلانٹ میں مہارت، موجودہ طاقت کا توازن اسی سے برقرار رکھا جاسکتا ہے

۔۔۔عقب پر چھاونیوں کا انتظام، جس میں ریزرو فوج موجود رہے اور بوقت ضرورت کام آئے

۔۔۔دشمن کی صفوں میں جاسوسی کا نظام تاکہ دشمن کی چالوں سے آگاہی رہے

۔۔۔جنگی منصوبہ سادہ اور لچک دار ہو

۔۔۔محاذ جنگ کو زیادہ نہ پھیلایا جائے تاکہ علاقے پر کنٹرول رہے

۔۔۔ایک وقت میں ایک دشمن کا مقابلہ کیا جائے، چاہے اس کے لیے دیگر ممالک سے معاہدات کرنا پڑیں

۔۔۔فوج اور اسلحہ کی نقل وحرکت کے لیے رات کا وقت مقرر کیا جائے

۔۔۔ اقوام عالم سے مختلف دفاعی اور اقتصادی معاہدات کر کے دشمن کو تنہا کیا جائے، تاکہ وہ دفاعی موقف اختیار کرنے پر مجبور ہو سکے،

۔۔۔ عین حالت جنگ میں اور جنگ چھڑنے سے قبل نفساتی حربے استعمال کیے جائیں، دشمن کو ذہنی دباؤ میں لایا جائے تاکہ اس کو شکست سے دوچار کیا جا سکے۔

یہ ہیں وہ اسلامی تعلیمات، جن کی عملی تفسیر رسول اللہ ﷺ نے پیش کی اور دنیا نے انتہائی حیرت کے عالم میں ناقابل یقین فتوحات کو یقین میں ڈھلتے دیکھا۔ اور یہی وہ زندہ تعلیمات ہیں کہ جن پر عمل پیرا ہو کر آج بھی مسلمان فوجیں وہی نتائج حاصل کر سکتیں ہیں جو ان کے اسلاف حاصل کر گئے۔

مراجع وحواشی

۱۔ بحوالہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ''عہد نبوی کے میدان جنگ'' کراچی ۱۹۲۸ص ۶۔ War affairs training regulation, page 23, London 1934

۲۔ حمید اللہ، محمد، ڈاکٹر ''عہد نبوی کے میدان جنگ''، ص ۸ (کراچی ۱۹۲۸ء)

۳۔ شاہ مصباح الدین شکیل، ''رسول اللہ کی دفاعی اور عسکری حکمت عملی''، مقالہ مشمولہ ششماہی ''السیرہ''، شمارہ ۳، جون ۲۰۰۰

۴۔ محمد اشرف شاہین قیصرانی ولیفٹننٹ کرنل محمد گل نواز ''رسول اللہ کی جنگی حکمت عملی'' مشمولہ 'السیرہ' شمارہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۴

۵۔ القرآن سورۃ البقرہ: ۱۹۰

۶۔ القرآن سورۃ البقرہ: ۱۹۱

۷۔ القرآن سورۃ البقرہ: ۲۵۱

۸۔ القرآن سورۃ مائدہ: ۵۱

۹۔ القرآن سورۃ مائدہ: ۸۲

۱۰۔ القرآن سورۃ البقرہ: ۲۴۶

۱۱۔ القرآن سورۃ البقرہ: ۲۵۰، ۲۵۱

۱۲۔ رسول اللہ ﷺ کے صفاتی ناموں میں ایک نام ''رسول ملاحم'' بھی ہے، جس کے لغوی معنی ہیں 'جنگ لڑنے والا'۔ عربی میں الملحمۃ کے معنی ہیں 'گھمسان کی جنگ کا موقع لہذا اس کے معنی گھمسان کی لڑائی لڑنے والا بھی کہے جاتے ہیں۔

۱۳۔ مسند احمد، ج ۲، ص ۱۴۷ (بیروت ۱۹۹۳ء)

۱۴۔ حاشیہ صحیح مسلم، مترجم خالد وحید زمان، ج ۵، ص ۱۰۶ (لاہور، ت ن)

۱۵۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، ''الجہاد فی السلام'' ص ۱۸۱ (لاہور، ۲۰۰۱ء)

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۸۴

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۸۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۱۹۔ جنگ اوازہ کا مشہور واقعہ ہے کہ بنی شیبان کے جتنے اسیر منذر بن امراؤالقیس کے ہاتھ آئے ان سب کو اس نے کوہ اوارہ کی چوٹی پے بیٹھا کر قتل کرانا شروع کیا، اور کہا کہ جب تک ان کا خون بہہ کر پہاڑ کی جڑ تک نہ پہنچ جائے گا قتل کا سلسلہ بند نہ کروں گا۔ یہاں تک کہ مقتولوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی تو مجبوراً اس نے منت پوری کرنے کے لیے خون پر پانی ڈلوایا اور وہ بہہ کر پہاڑ کی جڑ تک پہنچ گیا۔ (ابن اثیر، ج ۱، ص ۴۰۹)

۲۰۔ ایران اور روم کے مذہبی مظالم سے کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ گبن نے اپنی تصنیف میں ان کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، مثلاً ایک دفعہ جب خسرو پرویز نے قیصر مادیس کا بدلہ لینے کے بہانے سے سلطنت روم کے خلاف اعلان جنگ کیا تو اپنے حدود مملکت میں مسیحیوں کے کلیسا مسمار کرادیئے نذر کے اموال لوٹ لیے اور صلیب پرستوں کو آتش پرستی پر مجبور کیا گیا۔ (گبن، ''رومن ایمپائر'' ج ۵، ص ۴۶)

۲۱۔ الجہاد فی السلام، ص ۲۱۰

۲۲۔ القرآن سورۃ الفرقان: ۶۸

۲۳۔ الجہاد فی السلام، ص ۳۲

۲۴۔ القرآن سورۃ الحج: ۴۰

۲۵۔ القرآن سورۃ الحج: ۳۹۔۴۰

۲۶۔ القرآن سورۃ النساء: ۷۵

۲۷۔ القرآن سورۃ النساء: ۹۷

۲۸۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے 'الجہاد فی السلام'

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ القرآن سورۃ انفال: ۶۰

۳۱۔ القرآن سورۃ الصف: ۴

۳۲۔ القرآن سورۃ البقرہ: ۴۵، ۴۶

۳۳۔ القرآن سورۃ انفال: ۶۰، ۶۱

۳۴۔ القرآن سورۃ النساء: ۱۰۲

۳۵۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الرمی والحث علیہ

۳۶۔ حمید اللہ، محمد، ڈاکٹر، ''پیغمبر اسلام'' مترجم: خالد پرویز، (بیکن بکس، لاہور، ۲۰۰۵)

۳۷۔ مزید معلومات کے لیے دیکھئے "البدایۃ والنھایۃ" ج۳، ص ۳۶۴۔۳۶۵)

۳۸۔ توریہ سے مراد ایسی فوجی کاروائی یا نقل و حرکت ہے جس کی وجہ سے دشمن اصل منصوبے سے آگاہ نہ ہو سکے۔ رسول اللہ عموماً پیش قدمی کے وقت مروجہ راستے سے ہٹ کر دوسرا راستہ اختیار کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ خود صحابہ کرام بھی لاعلم ہوتے تھے کہ کس علاقے کا قصد ہے۔

۳۹۔ رسول اللہ ﷺ کی جنگی حکمت عملی، ص ۲۹۴

۴۰۔ حمید اللہ، محمد، ڈاکٹر، "خطبات بھاولپور" خطبہ ۸، 'عہد نبوی میں نظام دفاع اور غزوات' (ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۷)

۴۱۔ رسول اللہ ﷺ کی جنگی حکمت عملی، ص ۲۹۳

۴۲۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ خیبر، نیز ہشام، عبد الملک، "السیرۃ النبویۃ" ج ۲ (بیروت، ۱۴۷۱)

۴۳۔ مزید دیکھئے۔ ڈاکٹر حمید اللہ "عہد نبوی کے میدان جنگ"

۴۴۔ الجہاد فی السلام، ص ۳۲۲، ۳۲۳ ۴۵۔ ایضاً، ص ۴۶۰

۴۶۔ نکولو مکیاولی، "بادشاہ" مترجم، محمود حسین، ص ۱۰ تا ۱۲ (شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۱۹۸۵ء) ۴۷۔ ایضاً ص ۶۴

۴۸۔ ایضاً ص ۷ ۴۹۔ رسول اللہ ﷺ کی دفاع و عسکری حکمت عملی، ص ۱۷۶